رسائل و مسائل

قصصِ سلیمانؑ و یوسفؑ کے بعض اشکالات

جناب ملک غلام علی صاحب ۔ منصورہ

سوال :۔ درج ذیل اشکالات پیش کر کے رہنمائی کا طالب ہوں۔ امید ہے جواب سے نوازیں گے

۱۔ سورۃ السبا کی آیت نمبر ۱۴ کا ترجمہ تفہیم میں یوں ہے۔ " پھر جب سلیمانؑ پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز، اس گھن کے سوا نہ تھی جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ اس طرح جب سلیمانؑ گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔" اس آیت کی تشریح میں حاشیہ نمبر ۲۴ پر مولانا مغفور نے زمانۂ جدید کے ان مفسرین کی رائے سے اختلاف فرمایا ہے جو یہ تاویل کرتے کرتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت سلیمانؑ کا بیٹا رجعام ہے جو انتہائی نالائق ہونے کی وجہ سے اپنے جلیل القدر والدِ گرامی کی عظیم الشان سلطنت کو نہ سنبھال سکا اور اس کی جانشینی کے تھوڑے ہی عرصے بعد اس سلطنت کا قصر دھڑام سے زمین پر آرہا۔" یہاں مولانا نے زبردست عقلی دلائل سے اس تاویل کو رد کرتے ہوئے اس کیفیت کو صورتِ واقعہ قرار دیا ہے جو آیت کے ترجمے سے مترشح ہوتی ہے۔ بادی النظر میں ایک قاری اس عقلی استدلال سے واقعی مطمئن ہو جاتا ہے لیکن ذرا غور کرنے پر یہی عقل ایک سوال سامنے لا کھڑا کر دیتی ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ اللہ کا ایک برگزیدہ نبی اور ایک عظیم الشان سلطنت کا بادشاہ اپنے تمام کارہائے نبوت اور انتظاماتِ ملکی ترک کر کے

ایک قصر کی تعمیر و نگرانی میں ایسا منہمک ہو جاتا ہے کہ اس کی بے پایاں ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اور پھر بھی لوگ اس غیر فطری صورتِ حال سے نہیں چونکتے؟ بے شک ذمہ داریوں کی حد تک یہ توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اپنا کوئی نائب مقرر کر کے فراغ حاصل کر لیا ہو گا۔ لیکن اس پہلو کی تشنگی کیسے بجھے گی کہ ایک معروف ترین اور جلال و شکوہ کا پیکر انسان اچانک ایک دن تمام ذمہ داریاں تج کر ایک جگہ کھڑا ہو جاتا ہے، نہ وہ لیٹتا ہے، نہ سوتا ہے، نہ کچھ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے، نہ اُسے حوائج ضروریہ لاحق ہوتی ہیں حتیٰ کہ وہ ہلتا جلتا نہیں ہے۔ اور یہ کیفیت دو چار لمحے کے لیے نہیں بلکہ ہفتوں یہی صورت برقرار رہتی ہے۔ اور رعیت کے کسی انسان یا جن کو شبہ تک نہیں ہوتا کہ موصوف زندہ ہے یا مُردہ۔ ظاہر ہے کہ سیدنا سلیمان کی وفات سے یکسر عصا کو گھن لگ کر گرنے میں کم از کم ہفتوں کا وقفہ درمیان رہا ہو گا ایسی عظیم ہستی کے تو چند گھنٹے بھی خلاف معمول گزرنے مستبعد نظر آتے ہیں کجا کہ ہفتے، مہینے۔ آخر یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے براہ کرم وضاحت فرمائیں۔

۲۔ سورہ الیوسف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کے بھائی حصولِ اناج کے لیے مصر آتے ہیں تو سیدنا یوسفؑ تو انہیں پہچان جاتے ہیں، لیکن برادرانِ یوسفؑ آنجناب کو نہیں پہچان پاتے۔ اور حضرت یوسفؑ اُن کے علم میں لائے بغیر ان کے اناج کے توڑوں میں وہ پونجی بھی رکھوا دیتے ہیں جس کے عوض میں وہ حضرات اناج حاصل کر کے لے جا رہے ہیں۔ برادرانِ یوسفؑ اپنے مستقر پر پہنچ کر جب اناج کے بوجھ کھولتے ہیں تو اُن میں اپنی پونجی بھی موجود پاتے ہیں۔ اور خوش ہو کر اپنے والد گرامی حضرت یعقوبؑ سے کہتے ہیں کہ "اے ابا جان! ہمیں اور کیا چاہیے۔ ہماری خرچ کردہ پونجی واپس ہو گئی ہے۔ اب ہم اور رسد لائیں گے"۔ یہاں مجھے یہ سوال پریشان کیے ہوئے ہے کہ گو حضرت یوسفؑ نے جان بوجھ کر بھائیوں کے علم میں لائے بغیر یہ رقم رکھوا دی تھی لیکن برادرانِ یوسفؑ کو اور حضرت یعقوبؑ کو تو علم نہ تھا کہ یہ رقم دانستہ لوٹائی گئی ہے۔ ایسی صورت میں دیانت و امانت کا بنیادی تقاضا تو یہ تھا کہ غلط فہمی

یا سہو سے واپس آئی ہوئی اس رقم کو امانت سمجھا جاتا - اور اس کے واپس کرنے کی تدبیر کی جاتی - لیکن حیرت ہے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر بھی اس پہلو پر غور نہیں فرماتے — قرآن کریم یا کسی روایت میں قطعاً کوئی اشارہ ایسا نہیں ملتا جس سے معلوم ہو کہ حضرت یعقوبؑ نے اس رقم کو لوٹانے کا کوئی ارادہ کیا ہو یا خیال بھی ظاہر کیا ہو۔

۳ - تاریخ اسلام کا ایک بہت ہی مشہور واقعہ ہے کہ ایک مسلمان اور ایک یہودی نے دربار رسالتؐ میں حاضر ہو کر اپنا تنازعہ پیش کیا - آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعات مقدمہ سن کر فیصلہ یہودی کے حق میں دیا - واپس آتے ہوئے اس مسلمان منافق نے معاملہ حضرت عمرؓ کے پاس لے جانے کو کہا اور جب یہ دونوں حضرات حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوئے اور عمر فاروق کو یہ معلوم ہوا کہ اس قضیے کا فیصلہ قبل ازیں آنحضرتؐ فرما چکے ہیں تو آپ نے اس منافق مسلمان کا سر قلم کر دیا - اسی واقعہ کی بنا پر دربار رسالتؐ سے حضرت عمرؓ نے فاروق کا خطاب پایا - سوال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے آخر کس اختیار کی بنا پر ایک شخص کی گردن ماری جب کہ اسلام کا ایک باقاعدہ عدالتی، شہادتی اور تعزیری نظام ہے۔

جواب: - آپ نے جس اہتمام سے اپنے اعتراضات اور اندیشہ ہائے دور و دراز کی عمارت تعمیر کی ہے اس کا جواب اگر تفصیل سے دینے کی کوشش کی جائے تو وہ بھی کم از کم ایک کتابچے کی شکل اختیار کر لے گا، تاہم میں مختصراً آپ کے اشکالات کا جواب عرض کرتا ہوں:-

۱ - قرآن مجید کی آیات یا تفہیم القرآن کے حواشی میں یہ مضمون بیان نہیں ہوا کہ حضرت سلیمانؑ اپنے تمام کارہائے نبوت اور انتظام ملکی کو ترک کر کے ایک قصر کی تعمیر و نگرانی میں ایسے منہمک ہو گئے کہ دوسری بے پایاں ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صورت باقی نہیں رہی تھی - قرآن مجید میں صرف یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے لیے بعض جنات کو (جو غالباً سرکش اور کافر ہوں گے) ایسا مسخر کر دیا تھا کہ وہ حضرت سلیمانؑ کے لیے عمارتیں اور دھات کی دیگیں وغیرہ بناتے تھے - اس کام میں حضرت سلیمانؑ کے لیے شب و روز کسی لمبے عرصے تک ایک ہی جگہ بیٹھ کر نگہداشت کرنا ضروری نہیں تھا - البتہ ایسا ہونا اغلب ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کسی روز کسی متعین مقام پر تشریف

ہو کر جنات کو مصروفِ کار دیکھ رہے ہوں گے کہ اُن کے اُوپر قضائے اجل وارد ہو گئی۔ اُن کے ہاتھ میں جو عصا ہو گا وہ اگرچہ چند گھنٹے بھی غیر متحرک رہا ہو تو اُسے دیمک نے چاٹ لیا ہو گا اور یہ ہمارا اپنا مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات کوئی چیز تھوڑی دیر تک زمین پر رکھی رہے تو اُسے دیمک لگنا شروع ہو جاتی ہے۔ مولانا مرحوم یا بعض دوسرے علماء نے اگر گھن کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے مراد بھی دیمک ہی ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ دآبۃ الارض (زمین کا جانور) اس کے لیے واضح قرینہ ہے۔ اگر عصا کا نچلا حصہ دیمک خوردہ ہو گیا اور اُدھر ہاتھ کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی ہو گی تو عصا زمین پر آ رہا ہو گا۔ اور جسدِ مبارک بھی ڈھلک گیا ہو گا۔ جنات چونکہ حضرت سلیمانؑ ہی کے لیے مسخر تھے، اس لیے انہوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو گا۔ اور یہ سوچا ہو گا کہ اگر حضرت سلیمانؑ کی موت کا پتہ انہیں بروقت چل جاتا تو وہ اسی وقت اس مشقت سے چھوٹ جاتے۔ بہرحال اس سارے سلسلۂ واقعات کے لیے ہفتوں اور مہینوں کا وقفہ ضروری نہیں، چند ساعتوں میں یہ سب کچھ رُونما ہو سکتا ہے۔

۲۔ جب مصر میں قحط پڑا تو غالب امکان اس کا ہے کہ جزیرہ نمائے سینا اور فلسطین بھی قحط کی زد میں آ گئے ہوں گے۔ اور سارے قحط زدہ علاقوں میں یہ خبر پھیل چکی ہو گی کہ مصر میں غلّے کے پرانے ذخائر موجود ہیں اور وہاں کے حکمران نہ صرف اپنے شہریوں کو بلکہ دوسرے قحط زدہ علاقوں کے باشندوں کو بھی غلّہ تقسیم کر رہے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں تو آپ نے بہت سے اشکالات سوچ لیے ہیں لیکن یہ نہیں سوچا کہ اُن کے صاحبزادے حضرت یوسفؑ جو نبی تھے انہوں نے غلّے کی خرید و فروخت کا کوئی باقاعدہ کاروبار نہیں شروع کر رکھا ہو گا۔ بلکہ امر زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ جو مستحق بھی اُن کے پاس آتا ہو گا وہ اس کی احتیاج کی تحقیق کے بعد اس کی ضرورت بلا معاوضہ یا بالمعاوضہ پوری کر دیتے ہوں گے۔ اُن کے بھائی اگر کچھ تھوڑی بہت پونجی لاتے ہوں گے تو وہ بھی غالباً بطور ایک ہدیہ کے پیش کی ہو گی اور حضرت یوسفؑ نے بھی شاید پورے ناپ تول اور حساب کتاب کے ساتھ اُن سے معاملہ نہیں کیا ہو گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ گنتی کے چند درہم یا دینار ہوں گے اور جب فلسطین پہنچ کر انہوں نے دیکھا ہو گا کہ ہماری پونجی بادشاہ نے چپکے سے ہمارے سامان میں رکھ دی ہے تو انہوں نے یہی سمجھا ہو گا کہ انہوں نے قصداً ہمارے سامنے اسے ہمارے

ہاتھ میں واپس کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ یہ ایک طرح سے تحفہ و ہدیہ کی تحقیر و توہین ہے۔ اب اس کے بعد کیا آپ سمجھتے ہیں کہ حضرت یعقوب فوراً انہیں کہتے کہ سینکڑوں میل اُلٹے چل کے جاؤ اور اس نقدی کو اُن تک پہنچاؤ۔ جب کہ یہ بات واضح تھی کہ حضرت یوسفؑ نے دانستہ اُسے اپنے پاس رکھنے اور اُسے واپس کرنے کے لیے ایک اسلوب اختیار کیا۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے جو کچھ کہا، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جب بادشاہ نے ہمارے معاملے میں اتنے حُسنِ سلوک اور فیاضی کا ثبوت دیا ہے تو جب ہمیں دوبارہ غلّے کی ضرورت ہوگی تو پھر جائیں گے، اپنے بھائی کو بھی ساتھ لے جائیں گے اور دوبارہ سارا ہدیہ پیش کر دیں گے۔ بائیبل کا بیان یونہی ہے کہ باپ بیٹے اس نقدی کو بوروں میں پاکر سہم گئے اور باپ نے کہا کہ اسے واپس لے جاؤ۔ بعض مفسرین نے بھی اسے بیان کیا ہے۔ لیکن فی الواقع اگر یہی صورت ہوتی تو یہ قصّے کا ایک اہم جزو تھا، جس کا قرآن میں حذف ہونا مستبعد تھا۔ واللہ اعلم۔

۳۔ یہودی اور حضرت عمرؓ کا جو واقعہ آپ نے لکھا ہے یہ پڑھا تو میں نے بھی ہے لیکن چونکہ حوالہ آپ نے بھی نہیں دیا، اس لیے اسے تلاش کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ لیکن اس واقعہ کی ایک روایت ایسی بھی میری نظر سے گزری ہے جس میں فقط حضرت عمرؓ کا تلوار نکال لینا مذکور ہے۔ اس میں منافق کے سر قلم کر دینے کا ذکر نہیں ہے۔ اور حضرت عمرؓ چونکہ سخت گیر انسان تھے۔ لہٰذا اُن کے بارے میں تلوار نکال لینے کے اور بھی کئی واقعات مذکور ہیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ ایک آدمی اگر مسلمان ہونے کا مدعی ہو اور اُس کے بعد اُسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ قابلِ قبول نہ ہو تو اُس کا یہ فعل ارتداد کی تعریف میں بھی آسکتا ہے۔ اور اس لیے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اُسے مُرتد اور واجب القتل سمجھ کر اس کا خاتمہ کر دیا ہو۔ مگر ہر خلیفہ کی حکم عدولی اور سرتابی پر یہ سزا نہیں دی جا سکتی۔ کسی دوسرے حاکم یا خلیفہ کے معاملے کو آنحضورؐ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ خلفائے راشدین کے فیصلوں سے اختلاف کیا گیا اور اُن پر بعض لوگ سب و شتم تک کرتے تھے، بعض اُن کی بیعت میں متامل تھے۔ لیکن خلفائے راشدین نے انہیں واجب القتل نہیں سمجھا اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اگر کوئی سب و شتم کرے یا اسلام لانے کے بعد آنحضورؐ کی اطاعت سے انکار کر دے تو صرف اُس شخص کو قتل کیا جا سکتا ہے۔